نام کتاب: اقبال کے چند خوشے

نام مصنف: ڈاکٹر انعام الحق کوثر

ناشر: قریشی پبلیکیشنز چوک مشن روڈ کوئٹہ

قیمت: 45 روپے مجلد سفید کاغذ

مبصر: ڈاکٹر وحید عشرت

ڈاکٹر انعام الحق کوثر بلوچستان ہی کے نہیں پاکستان کے بھی علمی ادبی افق پر معروف ادیب، ماہر تعلیم، اقبال شناس اور محبت کرنے والے انسان ہیں ''اقبال اور بلوچستان'' بھی ان کی کتاب بڑی معروف تھی جس سے ہمیں پتہ چلتا تھا کہ حضرت علامہ کو بلوچستان سے کس قدر دلچسپی تھی بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو'' اقبال کی نظم'' ''حریت'' کا وہ استعارہ ہے جو صدیوں تک انسانوں کو راہ منزل دکھاتا رہے گا اقبال نے بلوچستان کا اپنے بھائی کے مقدمے کے سلسلے میں سفر بھی کیا، اور بلوچستان میں اقبالیات کے فروغ کے لئے کی جانے والی کاوشوں سے بھی اس کتاب سے آگاہی ہوتی ہے۔

''اقبالیات کے چند خوشے'' اقبال پر ڈاکٹر کوثر کی کتاب، ان کے مقالات کا مجموعہ ہے اس کتاب میں اقبال اور تحریک پاکستان، نسل نو اور اقبال کا شاہین، اقبال اور قومیت، علامہ اقبال اور عصبیت، تعلیم اقبال کی نظر میں، تعلیم ایک تاریخی عمل کی حیثیت سے، اقبال مرد خود آگاہ، علامہ اقبال کا نظریہ اجتہاد، اقبال کا ذہنی

ارتقا بانگ درا کی روشنی میں، مرد حر اور مرد مومن مقالات ہیں، ڈاکٹر انعام الحق کوثر اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''موجودہ کتاب ''اقبالیات کے چند خوشے'' میرے گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے مقصد یہ ہے کہ اقبالیات کے مختلف گوشوں کو عام فہم اور دلچسپ انداز میں پیش کیا جائے۔''

اقبال کا اصلاح ملت کا مدعا اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب ان کے نور بصیرت سے ہر دھڑکتا ہوا دل روشنی اور حرارت پا سکے اگر میرے ان مقالات اور مضامین سے اقبال کی اس تمنا کی ذرا سی بھی تکمیل کے اسباب ہوتے ہیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت بار آور ہوئی

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی محنت یقیناً بار آور ہوئی ہے انہوں نے نہایت سادہ اور عام فہم الفاظ میں مضامین اقبال کا ابلاغ دیا ہے خصوصاً نوجوان نسل اور بلوچستان کے عوام میں اقبالیات کا شعور اجاگر کیا ہے ڈاکٹر کوثر کا میرے نزدیک سب سے اہم اور منفرد مقالہ اقبال اور عصبیت ہے لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال نے اپنی زندگی میں کم و بیش بیس ہزار شعر کہے ہیں اشعار کی زیادہ تعداد ایسی ہے جن سے حرکت اور حرارت پیدا ہوتی ہے اور انسان ہر قسم کی عصبیت سے بچ کر عمل کی طرف رجوع کرتا ہے ان کا محبوب پرندہ شاہین بھی سخت کوشی، بلند پروازی اور رفعت پسندی کا عملی ثبوت بہم پہنچاتا ہے ان کے نزدیک ''لالہ'' زندگی کی حرارت کا زمینی

اظہار ہے اور ''شفق'' اس کا آسمانی مظہر''

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا اسلوب نہایت سادہ، زبان ہر طرح کے تکلف اور ہر طرح کے الجھاؤ سے پاک اور مضامین بھی صاف اور واضح ہیں تمام لوگوں اور طلبہ کے لیے یہ کتاب یوں بھی رہنما ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نہایت اہم اور مشکل موضوعات کو بالکل عام فہم اور سادہ انداز سے بیان کیا ہے یہ کتاب دراصل ایک کلید ہے اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے جو ابھی مبتدی ہیں کتاب کا نام بھی بڑا منفرد ہے ''اقبالیات کے چند خوشے'' یوں کتاب کے عنوان ہی سے کوئٹہ چمن اور بلوچستان کے دوسرے شہروں میں مہک بار انگور کی بیلوں اور ان کے خوش ذائقہ خوشوں کی خوشبو آنے لگتی ہے خوشے کے عنوان ہی سے مصنف کی بلوچستانیت ٹپکی پڑتی ہے اور یوں اپنے علاقے سے فکر اقبال کو مانوس کرنے کے لیے یہ عنوان بڑا منفرد ہے۔

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب: غالب آگہی

مرتب: سید قدرت نقوی

ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی برائے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

صفحات: 368

مبصر: محمد نذیر رانجھا

قیمت: 125 روپے

خدا جانے یہ حقیقت ہے یا غلط العوام میں سے۔۔۔۔۔کہا جاتا ہے کہ ''غالب'' کو لکھے جانے والے خط پر صرف ''غالب۔۔۔۔۔دہلی'' لکھا جاتا تو ''غالب'' اسے وصول کر لیتے، اور اگر غالب کے نام کے ساتھ ان کے پتے کی تفصیل درج ہوتی تو وہ ڈاکیے سے کہتے کہ یہ خط میرا نہیں، کسی اور غالب کا ہے اس روایت میں کہاں تک صداقت ہے، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، لیکن یہ سچ ہے کہ برصغیر میں ایک ہی ''غالب'' ہے اور وہ ہے ''میرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی''، جو اپنے علم و فن شاعری کی بلندیوں کے سبب پورے جہان ادب پر چھایا ہوا ہے۔

آج تک ''غالب'' اور ان کے فن پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں زیر نظر کتاب ''غالب آگہی'' مرتبہ سید قدرت نقوی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے یہ نقوی صاحب کے خطوط (جو انہوں نے ''غالب شناسی'' کے لیے مولانا غلام

رسول مہر اور مولانا امتیاز علی عرشی کو لکھے) اور ان کے جواب میں ان دونوں بزرگوں کے خطوط کا مجموعہ ہے

''غالب'' کے احوال و آثار اور ان کے کلام کی تشریح و توضیح کے بارے میں اہل علم و قلم کے مابین بحث و تمحیص کا سلسلہ بہت طویل ہے، اور بعض مقامات و معاملات پر نوبت قلمی جنگ و جدل کی بھی آ جاتی ہے ایسی صورت پیش آ جانے پر مولانا غلام رسول مہر کی یہ سطور پلے باندھ لینے کے قابل ہیں:

''اختلاف رائے عیب نہیں، اور اس پر اعتراض بھی نہیں ہو سکتا میرزا غالب معصوم نہ تھے کہ ان کی کسی لغزش کو تسلیم کرنے میں تامل کیا جائے۔۔۔۔''
(ص 147-142)

کتاب میں ضمنی طور پر ''غالب'' کے احوال و آثار کے علاوہ دیگر علمی و تحقیقی گوشوں پر بھی مواد ملتا ہے، مثلاً ص 55 پر مولانا غلام رسول مہر کے ایک خط میں ایک وضاحت کے ضمن میں آیا ہے:

''الفاظ و محاورات کے علاوہ بعض اوقات نفس بیان بھی ایک خاص طبقے سے مخصوص ہوتا ہے، مثلاً ''شاہنامہ'' میں فردوسی نے جہاں رستم سپہ سالار ایران کی گفتگو عرب مسلمانوں کے نمائندوں سے نقل کی ہے، وہاں یہ بھی ملتا ہے''

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بہ جائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

(یعنی اونٹنی کا دودھ پینے والے اور گوہ کا گوشت کھانے والے عربوں کا معاملہ اب اس حد پر جا پہنچا ہے کہ کیانیوں کے تخت کی آرزو کرنے لگے ہیں)

مولانا شبلی مرحوم تک نے لکھا ہے کہ فردوسی نے یہاں اسلام کے خلاف ایرانیت کا تعصب ظاہر کیا، حالانکہ یہ فردوسی کی شاعری کا منتہائے کمال ہے اسے اپنے افکار و عقائد سے کوئی بحث نہیں، صرف بولنے والے کے کردار اور دل و دماغ کے مکمل اظہار سے بحث ہے۔ رستم کی گفتگو ایسی ہی ہو سکتی تھی۔

مولانا غلام رسول مہر کی یہ وضاحت علمی حد تک قابل قبول سہی لیکن تاریخی شواہد اور ایران و عرب کے قدیم روابط، اور فاتح و مفتوح کی حیثیت سے دو قوموں کے جذبات کے لحاظ سے مولانا شبلی کی تحریر و رائے سو فیصد درست ہے۔

زیر نظر کتاب جناب سید قدرت نقوی کی غالب سے محبت کا بین ثبوت ہے، اور یہ غالب اور ان کے فکر و فن کے شیدائیوں کے لیے ایک مرغوب تحفہ ہے ہم محترم مرتب اور محترم ناشر کو ایسی عمدہ کتاب شائع کرنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب: آتش زیر پا

مولف: آغا شیدا کاشمیری

ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی برائے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی

صفحات: 280

قیمت: 75

مبصر: محمد نذیر رانجھا

کچھ لوگ محض مشغلے کے طور پر لکھتے ہیں، اور بعض حضرات کسی خاص مقصد کے تحت۔۔۔ لکھنے والا اگر اپنے شغل سے محبت رکھتا ہو تو اس کی تحریر وقت گزارنے کے علاوہ بھی مفید ثابت ہوتی ہے کسی خاص مقصد اور مشن کے تحت لکھی جانے والی تحریر تو ہوتی ہی بڑی مفید ہے، لیکن جب اس کے خمیر میں محبت و محنت کا عنصر شامل ہو تو وہ نہ صرف مفید تر ہو جاتی ہے بلکہ لکھنے والے کی زندگی میں اس کی شہرت کا ذریعہ اور اس کی موت کے بعد اسے زندہ رکھنے والی شے بن جاتی ہے

''آتش زیر پا'' ایسے ہی ایک خاص مقصد و مشن کے تحت لکھی جانے والی کتاب ہے جسے آغا شیدا کاشمیری نے بڑی محبت اور محنت سے تالیف کیا ہے اس میں انہوں نے مشاہیر کے بچپن اور لڑکپن کے خود نوشت حالات کو جمع کیا ہے کل 36 شخصیات کے بچپن اور لڑکپن کے امٹ نقوش محفوظ ہیں جن میں ادباء، شعراء، محققین، صحافی، ادبی مدیران، فلاسفہ و ماہرین نفسیات اور سرپرستان علم و ادب

شامل ہیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، اختر شیرانی، احسان دانش، نشتر جالندھری، خواجہ دل محمد، حاجی لق لق، نفیس خلیلی، احمد ندیم قاسمی، نظر زیدی، غلام رسول ازہر، آغا شیدا کاشمیری، سردار عبدالمجید لشاری، عظیم قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، عبداللہ قریشی، نصر اللہ خان عزیز، عبدالمجید سالک، آغا شورش کاشمیری، وقار انبالوی، ابوسعید بزمی، خلیل صحافی، ڈاکٹر تحسین فراقی، خواجہ افتخار، سر شیخ عبدالقادر، میاں بشیر احمد، سید امتیاز علی تاج، میرزا ادیب، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید عشرت، شیر محمد اختر، حکیم محمد سعید، حکیم محمد حسن قریشی اور ڈاکٹر عبدالوحید شامل ہیں ہر ایک کے حالات و واقعات اس قدر دلچسپ، سبق آموز اور قابل رشک ہیں جیسے کوئی وسیع سمندر ہیرے جوہرات سے اٹا پڑا ہو بطور نمونہ چند واقعات ملاحظہ فرمائیں۔

1 ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے اپنے بچپن کے حالات میں لکھا ہے

''مجھے چاند سے بہت محبت ہے، رسمی شاعرانہ محبت نہیں، دلی محبت ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہے کہ جب میں تین سال کا تھا تو رات کے وقت 32 میل، ایک گاؤں سے لاہور، گھوڑے پر سوار ہو کر آیا چاند نکلا ہوا تھا اور سارا راستہ ساتھ ساتھ آ رہا تھا میں بار بار یہ پوچھتا تھا کہ چاند ہمارے ساتھ کیوں آ رہا ہے جس وقت میں یہ سفر کر رہا تھا، اس وقت میرے خاندان کے دو کے سوا تمام افراد طاعون میں مبتلا تھے انہوں نے وبا میں اپنی بستی کو چھوڑنا خلاف احکام رسول پاک ؐ جانا، اور سب

نے جان دے دی، لیکن مجھے امانت سمجھ کر میرے گھر لاہور پہنچا دیا۔ مجھے یہ سفر نہیں بھولتا چاند آج بھی ویسا ہے، میں بدل گیا ہوں، لیکن لڑکپن کے بہت سے اثرات باقی ہیں''

(ص 15)

2 مولانا ظفر علی خان اپنے بچپن اور لڑکپن کے بارے میں رقم طراز ہیں

(الف) ''میری شادی بارہ برس کی عمر میں ہوگئی تھی جب بیوی گھر میں آئی تو میں ایک مدت تک یہی سمجھتا رہا یہ کوئی مہمان لڑکی آئی ہے۔''

(ب) ''کم عمری میں والد صاحب کے ساتھ کشمیر کے دورے پر جایا کرتا تھا تو نماز کے وقت برف توڑ کر اس سے وضو کر لیا کرتا تھا''

(ص 9)

3 احسان دانش لکھتے ہیں

''میری مزدوری مجھے معماری تک لے گئی، مگر اس میں مطالعے کی گنجائش اور اچھی سوسائٹی کا فقدان تھا مزدوروں سے میٹوں کا رویہ، معماروں سے بڑے مستری کا برتاؤ، ٹھیکیداروں کی شاطرانہ دولت سازی، یہ سب میرے دل میں کھٹکنے لگیں، اور اسی چیز نے بڑھتے بڑھتے نقاب کے وہ گوشے اٹھائے کہ میں انسانوں کے گروہ میں فرشتوں اور شیطانوں کی تمیز کرنے لگا''

(ص 21)

4 حاجی لق لق رقم طراز ہیں

"میں بچپن میں بہت ہی آرام طلب تھا رات کے وقت پیشاب کی حاجت ہوتی تو بستر پر ہی دریا بہا دیتا سردی کے موسم میں کون اٹھے اور باہر جا کر پیشاب کرے! میری ماں بہت نیک اور بردبار تھی، جب وہ دیکھتی کہ میں نے پیشاب کر کے بستر کو گیلا کر دیا ہے تو بچاری مجھے اٹھا کر اپنی دوسری طرف سلا لیتی اور خود گیلی جگہ پر کھسک جاتی میں تھا بڑا شریر، وہاں بھی پیشاب کر دیتا مجھے ماں کا امتحان مدنظر ہوتا، لیکن ماں اس امتحان میں ناکام ہونے والی کب تھی! مجھے اٹھا کر اپنے سینے پر لٹا لیتی اور خود بحر قلزم میں پڑی رہتی"

(ص 31)

"آتش زیر پا" بار اول میں 1948ء میں طبع ہوئی، دوسری دفعہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی نے اسے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے اتنے طویل عرصے میں مؤلف کتاب اسے خوب سے خوب تر بنانے کی جستجو کرتے رہے، اور یوں در حقیقت یہ "گنج گرانمایہ" بن گئی

ختم شد----------The End